Edited

Acc No. 26767
12/3/59
Thesis

10029

A82

7/2
98

5/1
66/B

برکفِ "جامِ جنوں" و برکفِ "سندانِ عقل"

ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

جنون و حکمت

(رُباعیات)

جوشؔ (ملیح آبادی)

مکتبہ اُردو لاہور

دل، رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہات ڈالا ہم نے

ترتیب

قیمت چار روپے

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام چوہدری نذیر احمد پرنٹر چھپی اور مکتبۂ اردو
لاہور سے شائع ہوئی

حقائق

تا بود دلم ز علم محروم نہ شد کم بود ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
اکنوں کہ ہمی بنگرم از روئے خرد معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

(خیامؔ)

اپنے ہی دماغ و دل کا منقہور رہوں میں
خود اپنے ہی دل میں ایک ناسور رہوں میں
واقف ہوں کہ سوچنے میں ہے جی کا زیاں
کیا کیجیے، سوچنے پہ مجبور رہوں میں

کر سعی کہ کامگار کر دوں گا تجھے
کونین کا شہریار کر دوں گا تجھے
اک خس کا بھی راز جان لے گا جس وقت
"اللہ" سے میں دوچار کر دوں گا تجھے

کر روح میں بابِ کفر و ایماں مسدود
وہ فہم کی وحشت ہے، یہ دانش کا جمود
"انکار" بہ ایں دماغِ کمزور و علیل!
"اقرار" بہ ایں عقلِ ضعیف و محدود!!

نومیدیٔ نظارۂ انوار بھی جہل!
اُمیّدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال
"انکار" بھی جہل ہے، اور "اقرار" بھی جہل

ہنسنا بھی عجب شے ہے، رونا بھی عجیب
پانا بھی ہے طرفہ بات، کھونا بھی عجیب
اِک قادرِ مطلق کا بہ اوصافِ حُسن
"ہونا" بھی عجیب ہے، "نہ ہونا" بھی عجیب

اُلٹے گا فلک نقاب تیرے آگے
کھُل جائے گی ہر کتاب تیرے آگے
ہو جائے گا جب عارفِ یک ذرّۂ خاک
جُھک جائے گا آفتاب تیرے آگے

آزادیِ فکر و درسِ حکمت ہے گناہ
دانا کے لئے نہیں کوئی جائے پناہ
اس اژدرِ تہذیب کے فرزندِ رشید
یہ "مذہب" و "قانون"، عیاذاً باللہ!

مے علم کی پینا ہی نہ آیا اب تک
ساحل پہ سفینا ہی نہ آیا اب تک
اک نوچ کھسوٹ ہے خوشی کی باہم
انسان کو جینا ہی نہ آیا اب تک

یہ بزمگہِ عمل ہے بے نغمہ وصوت
اس دائرے میں ولولۂ روح ہے فوت
یک رنگی ویکسانیِ اسلوبِ حیات
در اصل ہے ایک سانس لیتی ہوتی موت

دل ہوتا ہے رُوبراہ گاہے گاہے
رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اِس ڈر سے کہیں "خودی" نہ بن جائے "خُدا"
کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

پامالِ غم، انسان ہوا جاتا ہے
بے چارہ پریشان ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو آتا ہے فرشتوں کا جمود
بڑھتا ہے تو شیطان ہوا جاتا ہے

طوفان کے عفریت کو بے بس کر دے
اِس برقِ جہاں سوز کو پھر خس کر دے
ہنگامہ بپا ہے علم سے اے معبُودؔ!
معصوم جہالتوں کو واپس کر دے

دیتا ہے کسے شیخ! جہنّم کی وعید؟
ہے سینۂ شرک میں بھی قلبِ توحید
کھُل جائے اگر کاکُلِ ظلمت کی گرہ
ہر خَم سے برس پڑیں ہزاروں خورشید

آزاد ہو روح ، شادمانی ہے یہی

بشّاش ہو قلب ، کامرانی ہے یہی

کچھ بھی ہو ، خراشِ قلب و نیشِ غم کو

محسوس نہ کر ، کہ زندگانی ہے یہی

دُنیا ہے فقط رنج بڑھانے کے لئے

کمبخت بٹھاتی ہے ، اٹھانے کے لئے

لازم ہے کہ رووؔں بھی تو ہنسنے کی طرح

جب چرخ ہنساتا ہے رُلانے کے لئے

پھُولوں کی اگر ہوس ہے، خاروں کو نہ دیکھ
عشرت کی ہے دُھن توسوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیرِ حیات ہے اگر پیشِ نظر
مُڑ کر بھی مِٹے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ

ناگفتہ ہیں آج تک فسانے لاکھوں
لب تشنۂ ساز ہیں ترانے لاکھوں
انسان کا دل نہ توڑ اے بندۂ یاس
گُم ہیں ابھی فطرت کے خزانے لاکھوں

اے زاہدِ حق شناس واے عالمِ دیں
حضرت کا مقام ہے فقط خلدِ بریں
انساں ابھی چل رہا ہے گھٹنوں گھٹنوں
اور آپ کو ہے قُربِ قیامت کا یقیں

انصاف اُبتوں کی چاہ دینے والے
حُسن اُن کو، مجھے نگاہ دینے والے
کس مُنہ سے مجھے حشر میں دے گا تعزیر؟
دل کو ہوسِ گناہ دینے والے

ہر دعوئے ارتقا کو مانا میں نے
ہر گوشۂ کائنات چھانا میں نے
سب جان چکا تو اے حریفِ دمساز
میں کچھ نہیں جانتا یہ جانا میں نے

ظلمت کا سُراغ کب لگایا ہم نے
جب سلسلۂ نور بڑھایا ہم نے
باقی نہ رہا علم کا جب کوئی سلوک
تب جا کے مقامِ جہل پایا ہم نے

کیا بات ہوئی کہ رو رہا ہے ناداں؟
کیوں مفت میں جان کھو رہا ہے ناداں؟
نالاں ہے کہ سخت ہے زمانے کی گرفت
یہ تجھ سے مذاق ہو رہا ہے ناداں

گرداب سے کھیل کر ابھرنے والے
ممنوع شجر سے اے نہ ڈرنے والے
اس ارض کا تحفۂ خلافت ہو قبول
فردوس میں اے گناہ کرنے والے!

جب عقل ہی بے کس ہو تو نیت کیسی
جب حکمِ مشیّت ہو، شرارت کیسی
ماحول و وراثت پہ ہے مبنی ہر فعل
خاطی پہ ترس کھائیے، نفرت کیسی؟

لو، موسمِ آہ و چشمِ نم آپہنچا
خلش و عہدِ الم آپہنچا دورِ
اے مژدۂ عیش سُن کے ہنسنے والو!
ہشیار! کہ پیغمبرِ غم آپہنچا

شاہنشہِ دلبری کے مجرے کو اُٹھو

لیلائے شگفتگی کے مجرے کو اُٹھو

لو، غم کی گرفت ہو گئی زہرہ گداز

پیغامبرِ خوشی کے مجرے کو اُٹھو

جب حدِّ طلب سے دل نکل جاتا ہے

سانچے میں طرب کے، درد ڈھل جاتا ہے

کر لیتی ہیں غم کا جب احاطہ نظریں

ہر اشک تبسّم میں بدل جاتا ہے

رقصاں ہو جو باطن میں، جوانی ہے وہی
پیدا ہو جو خود سے۔ کامرانی ہے وہی
چشمے کی طرح دل سے جو تیر کر پھوٹے
اے یارِ عزیز! شادمانی ہے وہی

یہ لمحۂ خوش، رمیدہ آہو تو نہیں؟
اس عیش میں کوئی غم کا پہلو تو نہیں؟
آنکھوں میں ہے پھر شرارِ عشرت غلطاں
ڈرتا ہوں کہ اس بھیس میں آنسو تو نہیں؟

ہے مہد سے تا لحد برابر بچپن!

صرف اِتنا ہٹا ہوا ہے پیری کا چلن

نام اپنے کھلونوں کے بدل لیتے ہیں

"اطفالِ بزرگ" یعنی پیرانِ کہن

تھے پہلے کھلونوں کی طلب میں بیتاب

پھر حُسن کے جلووں سے رہے بے خور و خواب

اب ہیں زن و فرزند پہ دل سے قُرباں

بوڑھے ہیں مگر ہنوز بچے ہیں جناب!

گُل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک
جُنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا دَر ہے مسدُود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

مستی کا نشان ہے، نہ سرشاری ہے
انسان پر اک خوابِ گراں طاری ہے
اور اس پہ یہ طُرّہ کہ نہیں یہ بھی خبر
خود موت بھی خواب ہے کہ بیداری ہے

آتش کے بغیر دُود، ممکن ہی نہیں
بے شامۂ لطفِ عُود، ممکن ہی نہیں
عنقا ہو جہاں دولتِ دیدار و شہُود
واں "عشق" کا ہو وجود، ممکن ہی نہیں

ہوتا ہے سکونِ غم بڑھانے کیلئے
آتی ہے ہنسی خُون رُلانے کے لئے
افسوس کہ تقدیر جلاتی ہے چراغ
ظُلمت کو بہ تفصیل دِکھانے کے لئے

ہاں نوعِ بشر جبیں بہ جبیں ہے اب تک
انساں "رہِ راست" پر نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مژدہ کہ سرکش بندہ
تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک!

ہر گام پہ یوں دام میں لاتا نہ ہمیں
ہستی کے فریب میں پھنساتا نہ ہمیں
ہم اتنے زبوں ہیں کہ جو ہوتا مقدور
شیطان ترس کھا کے ستاتا نہ ہمیں

اِنسان، اور اس درجہ تباہی، توبہ
آویزشِ انوار و سیاہی، توبہ
گھٹ کر بڑھنا ہے، اور بڑھکر گھٹنا
کیا دورِ تسلسل ہے الٰہی توبہ

خود سے نہ اداس ہوں، نہ مسرور ہوں میں
بالذّات نہ روشن ہوں نہ بےنور ہوں میں
مُختار ہے مُختار ہے مُختار ہے تُو
مجبُور ہوں مجبُور ہوں مجبُور ہوں میں

وہ کفر کی تکرار کیے جاتا ہے
یہ دین پر اصرار کیے جاتا ہے
اک عمر سے انکار پہ مائل ہے دماغ
اور دل ہے کہ اقرار کیے جاتا ہے

تھا جانِ چمن جن کا ترانہ اک دن
گم ہو گیا اُن کا آشیانہ اک دن
کہتی ہے جسے آج "حقیقت" دنیا
بن جائے گی یہ شے بھی "فسانہ" اک دن

میں ڈوب کے غرقِ سر گرانی نہ رہا
کیا لہر اُٹھے بحر میں پانی نہ رہا
سمجھا جو حیات کو تو بخشی گئی موت
جب موت عطا ہوئی تو فانی نہ رہا

خواہش کا رفیقِ کار نکلا وہ بھی
بے عُنصرِ اختیار نکلا وہ بھی
انساں کے ارادے کو کیا جب تحلیل
اک نوع کا اضطرار نکلا وہ بھی

عالم ہیں ہزار یُوں تو گورے کالے

اس پر بھی بہت شاذ ہیں حکمت والے

پھرتی ہیں جہالتیں نہ جانے کتنی

کاندھوں پہ عبائے علم و دانش ڈالے

تجھ سے جو پھرے گی تو کدھر جائے گی

لے جائے گا جِس سمت اُدھر جائے گی

دُنیا کے حوادث سے نہ گھبرا کہ یہ عُمر

جِس طرح گذارے گا، گزر جائے گی

جو شمع تھی، پروانہ ہوئی جاتی ہے

ہر زلفِ رسا، شانہ ہوئی جاتی ہے

تحلیل کی رو میں ہر حقیقت اے جوشؔ

فریاد، کہ افسانہ ہوئی جاتی ہے

صدموں میں بجائے نالہ ہائے خُوں بار

جیسے ہی کہ لب ہوئے تبسّم سے دوچار

کہتی ہُوئی دوڑی مری جانب یہ خوشی

"کس بات پہ مُسکرا رہے تھے سرکار؟"

محشر میں پہنا رہے ہیں مجھ کو زنجیر
اک بندۂ مجبور کی آخر تقصیر؟
آواز تو دو کوئی، کدھر ہیں آخر؟
ماحول و وراثت و سرشت و تقدیر

اِک مرد، حق آگاہ نظر آتا ہے
اِک کافر و گمراہ نظر آتا ہے
اِس کہنہ سرا میں ہر بد و نیک مجھے
مامورِ من اللہ نظر آتا ہے

دُنیا میں ہیں بے شمار آنے والے

آتے ہی رہیں گے روز جانے والے

عرفانِ حیات ہو مُبارک تجھ کو

اے شدّتِ غم پہ مسکرانے والے

افسوس ہے اے جی کے گنوانے والو

ہر سانس میں سو فریب کھانے والو

غم موجِ تبسّم سے نتھرا جاتا ہے

بیدار ہو اے اشک بہانے والو!

ہر بات پہ مُنہ ترا اُترتا کیوں ہے؟
جینے کے لئے بنا ہے، مرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل اے طفلِ حیات!
کونین خود اک کھیل ہے، ڈرتا کیوں ہے؟

گھٹ کر کوئی، نہ کوئی بڑھکر نکلا
درویش زبوں، نہ شاہ بہتر نکلا
دُنیا کے غم و خوشی کو تولا جس وقت
میزان میں ہر فرد برابر نکلا

تو پیکرِ عصمت ہے پشیماں کیوں ہے؟
وابستۂ اصطلاحِ عصیاں کیوں ہے؟
ممکن نہیں اک سانس مشیّت کے خلاف
ہر فعل، عبادت ہے، پریشاں کیوں ہے؟

ہاں مرگ و حیات کے سمجھتا ہوں میں راز
آغاز، انجام ہے تو انجام آغاز
دیتا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی
دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

جلوے معدوم ہیں نگاہیں لاکھوں
گردن مفقود، اور باہنیں لاکھوں
مبہوت ہے کاروانِ فکرِ انساں
"منزل" عنقا ہے اور "راہیں" لاکھوں

کِس نقش میں رنگِ حیّ و قیّوم نہیں
موہوم ہے اس طرح کہ موہوم نہیں
پردے میں ہے اِک قوّتِ اعلیٰ تو ضرور
اُس کے اوصاف کیا ہیں؟ معلوم نہیں

اِس دہر میں تا دیر ٹھہرنا بہتر
یا تیز روی سے کوُچ کرنا بہتر
بس زندہ ہوں اب تک اس تذبذب کے طفیل
جینے میں ہے فائدہ کہ مرنا بہتر

ایسا نہیں جُز منافق، انساں کوئی
ہو جس سے نہ بیزار و گریزاں کوئی
انسان وہی ہے در حقیقت، جس کو
یزداں کوئی کہتا ہو تو شیطاں کوئی

اِس فکر میں اِک عمر سے ہوں بے خور و خواب
کِس طرح معطّل ہوں رسوم و آداب
اچھّی تو ہے وضعِ راست گوئی، لیکن
برداشت بھی کر سکیں گے اُس کو احباب؟

یا رب اِتنی لوح، کُہنہ مضمون، یہ کیا؟
صدیوں کے لئے ایک ہی معجون، یہ کیا؟
ہر آن بدلنے والے اِنساں کے لئے
جو پھر نہ بدلنے والا قانون، یہ کیا؟

اوہام سے دل ڈرے ہوئے ہیں اب تک
کس طرح جبیں؟ مرے ہوئے ہیں اب تک
افسوس کہ اسلاف کے باسی اقوال
کانوں میں یہاں بھرے ہوئے ہیں اب تک

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا
دُنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوّت حاصل کر، اور مولیٰ بن جا
"معبود" نہیں ہے کوئی قوّت کے سوا

احقر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر

ابتر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر

از روئے شریعتِ خدائے کم و بیش

کافر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر

ہر صبح ہے شام بے نوا کے آگے

ہر نغمہ ہے فریاد گدا کے آگے

مفلس کا وہی حال ہے بندوں کے حضور

مُشرک کی جو حالت ہے خدا کے آگے

ہر صاحبِ جوہر کو سُبک سر کر دے
فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کر دے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کمبخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

ہاں سچ ہے کہ مُلکِ حق کا سلطان ہے شیخ
انساں جسے کہتے ہیں وہ انسان ہے شیخ
لیکن ترے حُسنِ ظن کو یہ عِلم نہیں
عصیاں سے محروم کہ نادان ہے شیخ

ہر سانس کو وقفِ صد شرارت کر دیں
اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ امیروں کے گِناتے ہیں گناہ
دولت اِنہیں دید و تو قیامت کر دیں

تعریف نہ کر رفیقِ جانی! میری
پامال بہت ہے زندگانی میری
یہ مجھ میں شرافت جو نظر آتی ہے
بُنیاد ہے اِس کی ناتوانی میری

انسان کو رفتہ رفتہ حیواں کر دے
ہر نور کو صد نار بداماں کر دے
دولت کہ فرشتوں سے بڑھا دیتی ہے
جم جائے اگر کہیں تو شیطاں کر دے

جو منزلتِ انتساب ہو جاتے ہیں
اک رُخ سے مگر خراب ہو جاتے ہیں
انسان کے سینے میں ہُنر کے ہمراہ
کچھ عیب بھی باریاب ہو جاتے ہیں

کچھ اِس کے نہیں خلاف ہونے والا
مطلع یہ نہیں ہے صاف ہونے والا
ہاں مِل کے رہے گی تنگ دستی کی سزا
یہ جرم نہیں معاف ہونے والا

بھٹکی ہوئی دانش سے حماقت بہتر
ناپختہ ذہانت سے غباوت بہتر
جو راہِ طلب میں بیٹھ جائے تھک کر
اُس علمِ قلیل سے جہالت بہتر

مُنہ شرم سے ڈھانپتی ہے عقلِ انساں
تھرّاتی ہے، کانپتی ہے عقلِ انساں
تحقیق کی منزلیں، عیاذاً باللہ
ہر گام پہ ہانپتی ہے عقلِ انساں

ہر نطق پہ اک گفتگو جاری ہے
ہر خاک پہ اک آبجو جاری ہے
حیوان و نباتات و جماد و انساں
ہر نبض میں اک ہی لہو جاری ہے

لاکھوں جسم، ایک جان، دیکھو تو ذرا
سو رُخ ہیں، اور ایک نشان، دیکھو تو ذرا
جِنّ و بشر و اہرمن و یزداں کا
ہے ایک ہی خاندان، دیکھو تو ذرا

اے خالقِ امرِ خیر و اے صانعِ شر
تجھ پر ہی تو ہے مدارِ افعالِ بشر
ہر ہجو کے تیر کا ہدف ہے تری ذات
ہر مدح کی تان ٹوٹتی ہے تجھ پر

فتنے کی ندی میں ناؤ کھیتا ہوں میں
دھوکے کی ہوا میں سانس لیتا ہوں میں
اتنے کوئی دشمن کو بھی دیتا نہیں چھل
جتنے خود کو فریب دیتا ہوں میں

کیا "ذات" کی بھی شان ہے اللہ اللہ
رنگیں ہے "تفکّر" میں "تکلّم" میں سیاہ
کیا تجھ سے بیاں کروں کہ "سرِّ حق" کا
"احساس" "ثواب" ہے اور "اظہار" گناہ

احساس کا ہر ناز اٹھانا ہی پڑا

سر خاکِ مذلّت پہ جھکانا ہی پڑا

معلوم کئے ہزار اسرارِ حیات

ہستی کا مگر فریب کھانا ہی پڑا

دریا کے عمق میں جا، حبابوں کو نہ دیکھ

اوراقِ چمن الٹ، کتابوں کو نہ دیکھ

بکھرے ہوئے اک ذرّۂ خاکی کے حضور

ڈوبے ہوئے لاکھ آفتابوں کو نہ دیکھ

تقدیر کے دائرے میں آنا ہی پڑا
سر پائے مشیت پہ جھکانا ہی پڑا
واقف تھیں مآلِ گُل سے کلیاں لیکن
پھوٹی جو کرن تو مُسکرانا ہی پڑا

اپنی ہی گرفت میں خود انسان ہے آج
کل صاحبِ تدبیر تھا حیران ہے آج
جو وقت کے اقتضا سے تھی کل اک "رسم"
وہ وہم کے ارتقا سے "ایمان" ہے آج

ہر گُل کو ٹپکتا ہوا چھالا پایا
ہر طاقِ حرم کو اک شوالا پایا
کتنے مانے ہوئے حقائق کا ندیم!
اوہام ہی کو مورثِ اعلیٰ پایا!

ہر عالمِ دیں پناہ، جاہل نکلا
ہر کوہ مثالِ کاہ، بسمل نکلا
افسوس کہ کتنے میوہ ہائے "حق" کا
چھلکا جو ہٹا تو مغز باطل نکلا

شکرِ پروردگار کرتا شیطاں
دولت اپنی نثار کرتا شیطاں
انساں کی خباثت سے جو ہوتا آگاہ
اِک سجدہ نہیں، ہزار کرتا شیطاں

افسوس کوئی واقفِ منزل نہ ہوا
ناقص ہی رہا ہمیشہ، کامل نہ ہوا
ناداں پیدا ہوا تھا، ناداں ہی مرا
اِنساں کو کبھی بلوغ حاصل نہ ہوا

دُکھ عقل نے کیا کیا نہ سہے ہیں اب تک
کیا کیا نہ یہاں خُون بہے ہیں اب تک
پھر بھی یہ جبر اثیمِ روایاتِ کہُن
انساں کی طرف رینگ رہے ہیں ابتک

یہ عقلِ زبُوں مٹا کے چھوڑے گی مجھے
یہ آتشِ غم جلا کے چھوڑے گی مجھے
یہ راز کی پیاس، خون پی لے گی مرا
یہ علم کی بھوک، کھا کے چھوڑے گی مجھے

اِنساں پہ ہے کِس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

ہر دل ہے چراغِ زیرِ داماں، افسوس
ہر سانس ہے ایک طُرفہ طوفاں، افسوس
رونا بھی ہے تجھ پہ جور، ہنسنا بھی ستم
افسوس ہے اے غریب انساں، افسوس!

جب فکر نے راہ پر لگایا مجھکو
حکمت نے جب آئینہ دکھایا مجھ کو
ذرّات سے لے گئے تا بہ انجم واللہ
جُز اپنے کوئی نظر نہ آیا مجھکو

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوُں میں
پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے "میں" نکلتا ہے ندیم!
اِس پردے میں کائنات کہتا ہوں میں

محدود ہے جہل سے محبّت میری

کثرت میں دبی ہوئی ہے وحدت میری

کُل عالمِ محسوس و ورائے احساس

کِس درجہ وسیع ہے قرابت میری

وابستہ ہر ایک فرد آفات سے ہے

روزی سے یہ تنگ، وہ خیالات سے ہے

تو جس کی طرف چلا ہے حاجت لے کر

وہ سوختہ جاں بھی اہلِ حاجات سے ہے

عامی نے "حجابات" سے تعبیر کیا

عالم نے "نشانات" سے تعبیر کیا

اس ارض و سما کے ذرّے ذرّے کو مگر

عارف نے فقط "ذات" سے تعبیر کیا

جی بھر کے یہاں کوئی نظارا نہ ہوا

حد یہ ہے کہ صبر کا بھی یارا نہ ہوا

انساں کا کسی حال میں بھی خوش رہنا

خونخوار مشیّت کو گوارا نہ ہوا

ہنگامۂ قربِ دُور واپس لے لے
اے بارِ خدا، شعور واپس لے لے
ہر گام پہ موجزن ہے بحرِ ظلمات
ممکن ہو تو مجھ سے نُور واپس لے لے

کیا جانئے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے
دل رنج و الم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم
کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

چھانی ہر چند اک خدائی ہم نے
کیا کیا نہ یہاں خاک اڑائی ہم نے
واللہ کہ خشکی و تری میں کوئی شے
انساں سے عجیب تر نہ پائی ہم نے

کچھ بھی نہیں اس دہر میں اِلّا افسوس
افسوس ہے اے نظامِ دنیا افسوس
غم ہی کا نتیجہ غم ہو اتنا ہی نہیں
غم تو ہے خوشی کا بھی نتیجہ، افسوس!

کیونکر نہ روا ہو جان کھونا میرا

خود دار ہوں بیجا نہیں رونا میرا

افسوس کہ ہر شکل سے اے نفسِ غیور!

ثابت ہوتا ہے عید ہونا میرا

خونی چشمے اُبل رہے ہیں، یارب

خنجر سینوں پہ چل رہے ہیں یارب

تجھ کو بھی خبر ہے کہ تری دُنیا میں؟

چھوٹوں کو بڑے نِگل رہے ہیں، یارب

پابندِ بقا رہا نہ کوئی اب تک
ہستی کی کوئی خیر منائے کب تک؟
قایم رہتا ہے زندگانی کا نظام
انسان سے موت کھیلتی ہے جب تک

کیا مجھ کو خبر نزاعِ مشرب کیا ہے
مردُود ہے کیا بلا مُقرّب کیا ہے
شاعر تو ہے خالقِ مذاہب اے دوست
شاعر سے نہ پُوچھ تیرا مذہب کیا ہے

ہر ہات میں تیغِ خونچکاں ہے یارب

ہر پاؤں میں زنجیرِ گراں ہے یارب

"مذہب" کی برادری سے دل تنگ ہوں میں

"انساں" کی برادری کہاں ہے یارب؟

خنجر ہے کوئی، تو تیغِ عریاں کوئی

صرصر ہے کوئی، تو بادِ طوفاں کوئی

"انسان" کہاں ہے؟ کس کرے میں گم ہے؟

یاں تو کوئی "ہندو" ہے "مسلماں" کوئی

تسنیم ہو جولانگہِ طوفاں، افسوس
پابندِ تعصّب ہو، اور انساں، افسوس
دریا جتنے ہیں، جا رہے ہیں سُوئے بحر
افسوس ہے تجھ پہ کُفر و ایماں، افسوس!

آلام سے ممکن ہی نہیں دل کو نجات
فریاد ہے اے تلخیٔ آئینِ حیات
جس چیز کو زندگی کا دیتے ہیں لقب
در اصل ہے وہ "مرگِ طویل السّکرات"

واقف ہوں، یہ خونابہ فشانی کیوں ہے
یہ شیون و آہ و نوحہ خوانی کیوں ہے
ہر سعیؔ و عمل ہے زندگانی کے لئے
لیکن نہ کھُلا کہ زندگانی کیوں ہے

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں
جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سُننے والے تمام ہو جاتے ہیں!
افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

اِنسان کی جس قدر بھی طرّاری ہے
بس وقت گزارنے کی عیّاری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بیکاری ہے!

اِک پَل مرنا ہے، اور اک پَل جینا
مرنا بے چین، اور بے کل جینا
اِک سانس میں زندگی ہے اک سانس میں موت
ممکن نہ ہوا کبھی مسلسل جینا

ہر سانس میں قانونِ سزا جاری ہے

ہستی نہیں اک قسم کی بیماری ہے

انساں پہ یہ زندگی ہے اِک قہرِ خُدا

بیمار پہ یہ رات بہت بھاری ہے

کیا جادۂ پیچیدہ ہے اللہ اللہ

ہر گام پہ ہوتا ہے مسافر گمراہ

منزلِ جستجوئے رازِ حق میں

حکمت اک "ظن" ہے اور حیرت ہے "نگاہ"

کھُلتے نہیں عُقدہ ہائے اسرارِ حیات
مِلتے نہیں نقشِ پائے اسرارِ حیات
تحقیق ہو گیا، سانس رُکی جاتی ہے
اسرارِ حیات، ہائے اسرارِ حیات

دل آتشِ حکمت سے پگھل جائے گا
آنکھوں سے لہُو بن کے نکل جائے گا
معلوم نہ ہو گا رازِ یک ذرّۂ خاک
اور عُمر کا آفتاب ڈھل جائے گا

اِس دہر میں اک نفس کا دھوکا ہوں میں
بجلی ہوں، بگولا ہوں، چھلاوا ہوں میں
گھبرائی ہوئی ہے جوششِ روحِ تحقیق
ہر ذرّہ پکارتا ہے "دُنیا" ہوں میں

صدہا غمگین ہیں، چند خوشنود بھی ہیں
سَو بہرِ زیاں ہیں، دو پئے سُود بھی ہیں
لاکھوں "موجود" تو ہیں پر "زندہ" نہیں
دس بھی نہیں جو "زندہ" بھی "موجود" بھی ہیں

موقوف نزاعِ کفر و ایماں کر دوں
اضداد کا رابطہ نمایاں کر دوں
اپنے دل سے اگر اٹھا دوں میں نقاب
کیا دَیر ہے، خود حرم کو ویراں کر دوں

اب رسمِ حقیقت ہے نہ آئینِ مجاز
اے سلسلۂ فکر، تری عمر دراز
بڑھتا ہی چلا گیا میں دِل کی جانب
آتی ہی رہی دیر و حرم کی آواز

چھالا سا تپک رہا ہے میرے دل میں
شعلہ سا بھڑک رہا ہے میرے دل میں
خورشید ہی پر کچھ نہیں موقوف اے جوش
ہر ذرّہ کھٹک رہا ہے میرے دل میں

ہر راہ میں شب خون ہی دیکھا میں نے
انسان کو مطعوں ہی دیکھا میں نے
وہ دشمنِ عقل ہو کہ دارائے خرد
دیکھا جسے مجنوں ہی دیکھا میں نے

ہر علم کو یاں قلیل پایا میں نے
ہر راہ کو بے دلیل پایا میں نے
"اللہ" کی مخلوق پہ ڈالی جو نگاہ
انساں کو بہت علیل پایا میں نے

راحت کا بجز غم کوئی مفہوم نہیں
بہلے کس طرح دل یہ معلوم نہیں
"اللہ" کی مخلوق میں واللہ اے جوشؔ
اِنسان سے بڑھ کر کوئی مظلوم نہیں

کیوں علمِ جہالت میں پھنساتا ہے مجھے
خود تو بڑھتا ہے اور گھٹاتا ہے مجھے
جتنا جتنا ابھر رہا ہے خورشید
اتنا ہی اندھیرا نظر آتا ہے مجھے!

اِک ذرّۂ ناچیز کو انجم سمجھا
اِک موجِ خفیف کو تلاطم سمجھا
اِس "علمِ قلیل" کو کہ ہے صرف اِک بُوند
افسوس کہ جاہلوں نے قلزم سمجھا

پامالِ خزاں طرب کا گلشن ہو جائے
رنگین سرشکِ خوں سے دامن ہو جائے
سب دل کی تمنّائیں نکل جائیں اگر
انساں کو زندگی اجیرن ہو جائے

اک فلسفہ سرِ ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں
تخییل کا سلسلہ ہے اور کچھ بھی نہیں
کہتا ہے جسے فخر سے انسان "یقین"
اک "وہم کا ارتقا" ہے اور کچھ بھی نہیں

نسلِ آدم میں کوئی معصوم نہیں

احساس کسی قلب میں معدوم نہیں

اُس فیضِ ازل سے جس کو کہتے ہیں گناہ

صد شکر کہ اک فرد بھی محروم نہیں

دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے

دریا تری آنکھوں سے بہا کرتا ہے

یکمشت اجل کو جان دینا بہتر

مرتا ہے باقساط، یہ کیا کرتا ہے؟

اِک آگ سی رہ رہ کے بھڑکتی ہے ضرور
سینے میں کلی سی اک چٹکتی ہے ضرور
واقف نہیں ہیں "خدا" سے لیکن اکثر
دل میں اک پھانس سی کھٹکتی ہے ضرور

مقصودِ کمال کیا ہے کس سے پوچھوں
تعبیرِ زوال کیا ہے کس سے پوچھوں
دانا مبہوت ہیں پیمبر خاموش
ہستی کا مآل کیا ہے کس سے پوچھوں

جس وقت جھلکتی ہے مناظر کی جبیں
راسخ ہوتا ہے ذاتِ باری کا یقیں
کرتا ہوں جب انساں کی تباہی پہ نظر
دل پوچھنے لگتا ہے "خدا" ہے کہ نہیں؟

ساغر ہے ازل کے دن سے خالی تیرا
گلشن ہے رہینِ پائمالی تیرا
افسوس کہ اِس دہر میں اے نوعِ بشر
وارث نظر آتا ہے نہ والی تیرا

للّٰلہ منہ آنسوؤں سے دھو لینے دے
رومال کو اشکوں سے بھگو لینے دے
انسان، اور انسان کی مجبوری پر
جی کھول کے اے ندیم! رو لینے دے

کھِلتے ہی گلاب خار ہو جاتا ہے
ہنستے ہی بس اشکبار ہو جاتا ہے
پیدا ہوتے ہی تیرہ قسمتِ انساں
اے موت! ترا شکار ہو جاتا ہے

چلتا نہیں دیکھتی ہے جادو اپنا
رہتی ہے بدل بدل کے زانو اپنا
بپھری ہوئی موت سے حیاتِ اِنساں
چلتی ہے بچا بچا کے پہلو اپنا

دِل نشّے میں ہے غرقِ سجُود، اے ساقی!
ہے دوشِ ہوا پہ بُوئے عُود، اے ساقی!
شاہد، خوشبو، نماز، ہر شے سے بہم
ہاں بھیج محمّد پہ درود، اے ساقی!

خود اپنے ہی دائرے سے باہر ہو جاؤں
اپنی ہی نگاہِ خیر میں شر ہو جاؤں
درپیش ہے وہ مقامِ قربِ کامل
اب یاد کروں اُنہیں تو کافر ہو جاؤں

یہ نارِ جہنّم یہ سزا کچھ بھی نہیں
یہ دغدغۂ روزِ جزا، کچھ بھی نہیں
اللہ کو "قہار" بتانے والو!
اللہ تو "رحمت" کے سوا، کچھ بھی نہیں

اس دہر کا بند و بست دیکھو گے اگر
شانِ فتح و شکست دیکھو گے اگر
ہو جائے گی سطحِ ذہن خود سے ہموار
دُنیا کے بلند و پست دیکھو گے اگر

کس مُنہ سے کہوں کہ راہ پیما ہوں میں
قادر ہوں عمل پہ، کارفرما ہوں میں
دریا کے اشاروں پہ جو چلتا ہے سدا
امواجِ حوادث کا وہ تنکا ہوں میں

قدسی، سب اِن سے کہہ چکے ہیں گویا
اسرار کی آنچ سہ چکے ہیں گویا
اسماء و صفات کے گِنانے والے
صحبت میں خدا کی رہ چکے ہیں گویا

اوجِ زاہد کو پست پایا میں نے
اوہام کا بندوبست پایا میں نے
خالق کو تشخص کا کیا ہے پابند
مومن کو بھی بُت پرست پایا میں نے

اِس بزمِ خیال میں ٹھہرنا بھی فریب
اس راہ تو ہمّ سے گزرنا بھی فریب
واللہ کہ اس منزلِ آب و گِل میں
جینا بھی ہے اِک فریب مرنا بھی فریب

ہر شر میں نہاں خیر کا جوہر دیکھا
ہر خار کے پردے میں گِلِ تر دیکھا
جب چاک کیا ذرّۂ تاریک کا دِل
خورشیدِ ازل کو جلوہ گُستر دیکھا

ہندو نے اگر علم کا مندر چھوڑا
مسلم نے بھی راستی کا منبر چھوڑا
پنڈت نے اگر بنا دیا بُت کو خدا
مُلّا نے خدا کو بُت بنا کر چھوڑا

ہاں فردِ عمل سیاہ کرتا ہوں میں
ہر سانس میں سو گناہ کرتا ہوں میں
اس پر بھی ہوں قدسیوں سے بڑھکر معصوم
فطرت! تجھ کو گواہ کرتا ہوں میں

حُسن و عشق

جلووں کی ہے بارگاہ میرے دل میں
غلطیدہ ہیں مہر و ماہ میرے دل میں

اس دورِ خرد میں عشق گُم ہو جاتا
ملتی نہ اگر پناہ میرے دل میں

واقعات پروے میں ہیں اور واردات کاغذ پہ۔
کس میں "واقعات" بیان کرنے کی ہمت ہے کہ
"واردات" کی نقاب اُٹھ جائے؟

مچھلیاں زیرِ آب ہیں، اور حلقے سطحِ آب پر
کس میں غوطہ لگانے کی طاقت ہے کہ مچھلیوں کا
آب و رنگ معلوم کر لے؟

افسوس یہ سِن، یہ بدحواسی تیری
دل ہی نہیں، رُوح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو مُنہ اُترنے لگتا ہے ترا
کس درجہ مکمّل ہے اُداسی تیری

پابندِ ہراس کیوں ہے؟ تیرے قُرباں
آشفتہ حواس کیوں ہے؟ تیرے قُرباں
تجھ پر تو ہے انبساطِ عالم کا مدار
تُو اِتنی اُداس کیوں ہے؟ تیرے قرباں

یوسف کے کلیجے کو مسلتی تھی کبھی
ہاں مصر میں یہ نسیم چلتی تھی کبھی
وہ لہر گزر رہی ہے تیرے رُخ سے
جو رُوئے زلیخا پہ مچلتی تھی کبھی

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا ترے درد، عیاذاً باللہ
لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

کیا عشق کا بھی اثر ہے، اللہ اللہ
اپنے سے وہ بے خبر ہے، اللہ اللہ
کونین کے زانو کو ہے ارماں جس کا
قدموں پہ مرے وہ سر ہے، اللہ اللہ

دل سینۂ نازک میں مچل جاتا ہے
چشمہ تری آنکھوں کا اُبل جاتا ہے
اللہ رے سوزِ غم کہ میرے آگے
پھولوں کا ترے رنگ بدل جاتا ہے

اے شدّتِ غم سے جان کھونے والی
اشکوں میں جوانی کو ڈبونے والی
حاصل ہو تجھے خندۂ صبحِ عشرت
اے پردۂ شب میں گھُٹ کے رونے والی

نغمے ترے فریاد ہوئے جاتے ہیں
خوں گشتہ بیداد ہوئے جاتے ہیں
راتیں یہ جوانی کی، مُرادوں کے یہ دِن
افسوس کہ برباد ہوئے جاتے ہیں

کہنا یہ ترا نیند کسے آتی ہے
راتوں کو طبیعت اور گھبراتی ہے
اُف سیج کے نامراد پھولوں کی مہک
ہر سانس میں اک پھانس سی چُبھ جاتی ہے

رُخ پر ہے ترے قلبِ تپاں کا پرَتو
ماتھے پہ ہے آتشِ نہاں کا پرَتو
غلطاں ہے اُداسی یہ تری آنکھوں میں
یا نہر میں ہے ابرِ خزاں کا پرَتو

اُٹھتی ہی نہیں شدتِ حرماں سے نگاہ
بنتی ہی نہیں بنائے سے زلفِ سیاہ
تُو اتنی بلا میں، اور میں یُوں مجبُور!
یا بارِ الٰہ، یا خُدا، یا اللہ!

آواز میں غلطاں ہیں نگاہیں گویا
گردن میں مری ہے تیری بانہیں گویا
اِس کرب سے اُٹھ رہی ہیں نیچی نظریں
آنکھوں سے نکل رہی ہیں آہیں گویا

ارماں تھے وہ کیا نگارِ دل جُو تیرے؟

مجروح تھے کروٹوں سے پہلو تیرے

اب لاؤں کہاں سے میں وُہ راتیں افسوس؟

بہتے تھے مرے لئے جب آنسو تیرے

وہ زردیٔ رُخ، وہ ناتوانی تیری

ہے ہے وہ خموش نوحہ خوانی تیری

راتیں وہ تجھے یاد ہیں؟ جب میرے لئے

سونے کو ترستی تھی جوانی تیری

انگارا ترا دہک رہا تھا ظالم
کوندا رُخ پر لپک رہا تھا ظالم
افسوس وہ عہدِ شوق جب دل میرا
سینے میں ترے دھڑک رہا تھا ظالم

رگ رگ میں بسی ہے تیری خوشبو اب تک
واللہ تھمے نہیں ہیں آنسو اب تک
اے رشکِ چمن اِدھر بٹھایا تھا تجھے
ویران ہے اُس دِن سے وہ پہلو اب تک

کیا دور تھا وہ اے بُتِ پُر فن تیرا
دیتا تھا مجھے ہوائیں دامن تیرا
ہے ہے وہ زمانہ، کھیلتا تھا پہروں
جب میری جوانی سے لڑکپن تیرا

آجا، مرتا ہوں غم کے مارے آجا
بھیگی ہوئی رات کے ستارے آجا
اے شام کا وعدہ کر کے جانے والے
اب ڈوب رہے ہیں دیکھ تارے آجا

ہے صبح اُفق سے جگمگانے والی
وعدے پہ ہے اُن کے مسکرانے والی
جا پچھلے پہر کے چاند! اُن سے کہدے
اب رات ہے دو گھڑی میں جانے والی

پھر صبر کی تلخ مے پیئے لیتے ہیں
پھر اپنا گریبان سیئے لیتے ہیں
کل ملنے کا وعدہ ہے تو خیر او ظالم
ہم اور بھی ایک دن جیئے لیتے ہیں

وہ آئے ہمیں جی سے گزرنا ہی پڑا
جب عذرِ جفا سُنا تو مرنا ہی پڑا
باوصفِ ملال و پاسِ ناموسِ جنوں
وہ ہنس کے بڑھے تو سجدہ کرنا ہی پڑا

اے رونقِ لالہ زار! واپس آجا
اے دولتِ برگ و بار! واپس آجا
ایسے میں کہ نو بہار ہے خلد بدوش
اے نازشِ نو بہار واپس آجا!

یہ صبحِ خنک آئینہ گر ہے گویا
ہر خارِ زبوں اِک گلِ تر ہے گویا
چہرے کا مرے گریۂ شب سے ہے یہ رنگ
برسی ہوئی رات کی سحر ہے گویا

کشتی مرے احساس کی کھیتا ہے کوئی
ہر سانس میں پیغام سا دیتا ہے کوئی
یارب! وہ کبھی زینتِ پہلو بھی بنے
یہ دل میں جو کروٹیں سی لیتا ہے کوئی

ٹپکاتی ہوئی گھٹا جب آنسو آئی
فرقت کا جگاتی ہوئی جادو آئی
ہلکا ہلکا دھواں کلیجے سے اٹھا
سوندھی سوندھی زمیں سے خوشبو آئی

سانچے میں گھٹا کے ڈھل رہا ہے کوئی
پانی کے دھوئیں میں جل رہا ہے کوئی
گردوں پر اُدھر جھوم رہے ہیں بادل
سینے میں ادھر مچل رہا ہے کوئی

برسات ہے، دل کو ڈس رہا ہے پانی
فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی
دل میں کبھی چبھتا ہے، کلیجے میں کبھی
آڑا ترچھا برس رہا ہے پانی

بہلانے سے، دم بھر نہ بہلتا ہوگا
دل حُسن کا چٹکیوں میں ملتا ہوگا
اے نالۂ شبگیر! خدارا تھم جا
بستر پہ وہ کروٹیں بدلتا ہوگا

میں رات گئے اُٹھا ہوں سوتے سوتے
آنکھوں کا بُرا حال ہے روتے روتے
تارے کے قریب ماہِ نو ہے، اے کاش!
اِس وقت مِرے قریب تم بھی ہوتے!

وہ دیکھتے، اور سسکیاں ہم بھرتے
حسرت ہے کہ قدموں پہ کسی کے مرتے
اے بادِ صبا! ملیں تو اُن سے کہنا
مُدّت ہوئی انتظار کرتے کرتے

ناگن بن کر مجھے نہ ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نہ کسنا بادل
وہ پہلے پہل جُدا ہوئے ہیں مجھ سے
اِس دیس میں ابکی نہ برسنا بادل

پُرشور ہوائیں ہیں، گھٹا ہے گمراہ
دریا بہکا ہوا ہے، موجیں ہیں سیاہ
اک آنچ سی ہے دل کے قریب، اور وہ دور
تقدیر کا اور یہ ظلم، اللہ، اللہ!

نکلی لبِ گُل سے "آہ" خوشبو بنکر
سر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سر سے گئی دل میں اُن کی تصویر لئے
تصویر ٹپکنے لگی آنسو بنکر

ہر آن ہوا ستائے جاتی ہے مجھے
پانی کی جھڑی رلائے جاتی ہے مجھے
گاتی ہوئی یہ گھٹا، یہ بھیگی ہوئی رات
تو پاس نہیں تو کھائے جاتی ہے مجھے

ہر دل، ہمہ تن جوش نظر آتا ہے
آشفتہ و مدہوش نظر آتا ہے
اے نازشِ کائنات! تیری خاطر
ہر آنکھ میں آغوش نظر آتا ہے

دل عقدۂ مشکل کو دعا دیتا ہے
ہر ضربتِ کامل کو دعا دیتا ہے
ہاں کون ہے مقتولِ محبّت کے سوا
جو بازوئے قاتل کو دُعا دیتا ہے؟

اے ابرِ سحر کو گھر کے آنے والے

خورشید کو ظلمت میں چھپانے والے

اب تک مرے پہلو میں ہے وہ پیکرِ ناز

قرباں ترے عمرِ شب بڑھانے والے

چونکا ہے کوئی نگار، الٰہی توبہ

رس میں ڈوبا خمار، الٰہی توبہ

سکتے میں ہیں بھیرویں کی تانیں گویا

ہونٹوں کا خفیف اُبھار، الٰہی توبہ

صحرا میں چھری سی دل پہ چل جاتی ہے
ہر سانس کلیجے کو مسل جاتی ہے
حیراں ہوں کہ کس طرح گلوں کی "خوشبو"
"رُخسارۂ جاناں" میں بدل جاتی ہے

گلشن میں کہاں سے یہ اثر آتا ہے؟
تخئیل کا ہر نقش اُبھر آتا ہے
اوڑھے ہوتے ہلکی سی دُلائی کوئی شوخ
خوشبو میں چنبیلی کی نظر آتا ہے

آلام سے ہے نجات میرے دل کو
چھوتی نہیں کائنات میرے دل کو
رہتا ہے جو پردۂ تغافل میں نہاں
حاصل ہے وہ التفات میرے دل کو

جنّت کی کھلی ہے راہ میرے دل میں
ہر داغِ وفا ہے ماہ میرے دل میں
ہوتی نہیں جو کم نگہی سے محسوس
پیوست ہے وہ نگاہ میرے دل میں

گردن میں مری پڑی نہ بانہیں تیری
ہونٹوں سے نکل سکیں نہ آہیں تیری
واللہ کہ اب مجھ پہ جہنّم ہے حرام
ہنگامِ سفر ہائے نگاہیں تیری

میداں میں ہے جھٹپٹے کی بوجھل خوشبو
گردوں پہ شفق بدل رہی ہے پہلو
اک آن میں آگ ہوں تو اک آن میں خاک
کیا جانئے اس وقت ہے کس حال میں تُو؟

پھر دل میں خوشی کا راج دیکھا میں نے
پھر فرقِ جنوں پہ تاج دیکھا میں نے
پلٹے جو سفر سے تم تو اک عمر کے بعد
اپنی جانب پھر آج دیکھا میں نے

ظاہر میں کدورت ہے، صفائی ہے یہی
ٹھکراتا ہے دل کو، دلربائی ہے یہی
بیگانہ وشی پہ یارِ شاطر کی نہ جا
نادان! کمالِ آشنائی ہے یہی

ہر صبح شکستہ حال پاتی ہے مجھے
ہر موجِ صبا، خون رُلاتی ہے مجھے
تھم تھم کے سحر کو چہچہاتے ہیں طیور
رہ رہ کے کسی کی یاد آتی ہے مجھے

کچھ بُعدِ زماں ہے نہ مکاں، اے دمساز
جب جان لیا قُربتِ محبوب کا راز
اب ایک نفس کی بھی نہیں ہے فُرقت
اے سلسلۂ ہجر! تری عمر دراز!

نقشِ فرقت ابھار دے گا دل پر
سارا غصّہ اُتار دے گا دل پر
اس ڈر سے اُٹھاتا نہیں آنکھیں سوئے ماہ
دیکھوں گا تو ڈنک مار دے گا دل پر

یہ شامِ فراق، یہ سیاہی توبہ
اِک جان اور اس حد کی تباہی توبہ
وہ بوجھ ہے سر پر کہ عیاذاً باللہ
وہ ٹیس ہے دل میں کہ الٰہی توبہ!

فریاد، رگوں سے دم کھنچا جاتا ہے
دل ہجر میں بیٹھا ہی چلا جاتا ہے
چھٹتے ہی پہ نبضیں ہیں اکھڑنے ہی پہ سانس
اللہ! یہ کیا جی کو ہوا جاتا ہے

گھیرے رہو میرے غمگسار مجھ کو
میں ڈوبنے والا ہوں، ابھارو مجھ کو
فرقت کی ابھی ہیں ابتدائی راتیں
خلوت میں نہ بیٹھنے دو یارو مجھ کو

مایوس ہوں، ذوقِ خوشدلی کی سوگند
ہر سانس ہے موت، زندگی کی سوگند
ہر چیز نظر آتی ہے دُھندلی دُھندلی
فُرقت کی اُداس چاندنی کی سوگند

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی
کیا جانئے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا "جوشؔ مجھے کہتے ہیں"
آنکھوں کو جھکا کے مُسکرایا کوئی!

لازم ہے دوا ہی، نہ دعا یاد رہے
ہاں لعلِ لب و زلفِ رسا یاد رہے
حقّا کہ یہ ہے نوعِ بشر کی توہین
گر عہدِ جوانی میں خدا یاد رہے

فقروں کی یہ تازگی، یہ لہجے کی بہار
قرباں ترے اے نگارِ شیریں گفتار
اللہ ری کھنکتی ہوئی آواز تری
چینی پہ ہو جیسے اشرفی کی جھنکار

اللہ رے بدمست جوانی کا نکھار
ہر نقشِ قدم پہ سجدہ کرتی ہے بہار
اس طرح وہ گامزن ہے فرشِ گل پر
پڑتی ہے ہری دُوب پہ جس طرح پھوار

کیوں بال ہیں اس طرح پریشاں تیرے
کس غم سے ہیں نم دیدۂ حیراں تیرے
جس طرح کسوٹی پہ ہوں سونے کے خطوط
یوں رُخ پہ چھلک رہے ہیں ارماں تیرے

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے، روکے سحر کو روکے کوئی!

اے حُسن ٹھہر، آگ بھڑک جائے گی
صہبا تری، ساغر سے چھلک جائے گی
مجھ کو تو یہ ڈر ہے کہ دُلائی کیسی
انگڑائی جو لی، چلد مَسک جائے گی

پیرانِ سالوس

آں قوم کہ سجّادہ پرستند خرند | زیرا کہ بہ زیرِ بارِ سالوس درند
ویں از ہمہ طرفہ ترکہ در پردۂ زہد | اسلام فروشند و ز کافر بتر اند

(خیام)

قبروں پہ مُریدوں کو جھکاتے رہیئے
ڈھولک پہ سفیہوں کو نچاتے رہیئے
اللہ اگر رُوٹھ رہا ہے، روٹھے
کیا اِس سے غرض عُرس مناتے رہیئے

پُر ہول شکم عریض سینے والو
خوں، قومِ تہیدست کا پینے والو
تم اہلِ خرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد
خیرات پر احمقوں کی جینے والو

عُشّاق کریں ضُعف سے آہیں کیونکر
بیٹھا ہو جو دل اُٹھیں نگاہیں کیونکر
حیرت ہے مگر کہ عاشقانِ حق پر
کھُل جاتی ہیں فقر ہی کی راہیں کیونکر؟

عبرت کی نظر سے آشنا نے دیکھو
جاری ہیں ریا کے کارخانے دیکھو
شیطاں کی اُنگلیوں میں گردش کرتے
زُہاّد کی تسبیح کے دانے دیکھو

اے شیخ! کبھی تو رنج اُٹھایا ہوتا
اِس دل پہ کبھی تو زخم کھایا ہوتا
اِس طرح لگا تا نہ دمادم ضربیں
بابا! دل اگر کہیں لگایا ہوتا

مجرم ہیں ہمیں سزائیں دینے والے
طوفان ہیں خود سفینہ کھینے والے
واللہ کہ اک وبا ہیں بندوں کے لئے
ظاہر میں خدا کا نام لینے والے

نیکی کی ہمیں راہ بتاتے رہیئے
اللہ سے ہر آن ڈراتے رہیئے
پینے والوں کو کہتے رہئیے بے دین
اور شوق سے مالِ غیر کھاتے رہیئے

وہ رشتۂ تسبیح ہیں ہم پھندے ہیں
ہر عیب سے وہ پاک ہیں ہم گندے ہیں
دیکھو وہ نکل رہے ہیں مسجد سے شیوخ
گویا وہ خدا ہیں، اور ہم بندے ہیں

کیا کہیے تحیّر کی فراوانی ہے
ناقابلِ شرح دل کو حیرانی ہے
سنتے ہیں گنہ سے دور رہتے ہوئے شیخ
جیتا بھی ہے، اور شکل بھی اِنسانی ہے

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں؟
اِتنا ہی کہ بس "صلِّ علیٰ" کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر، بہ ایں ریشِ دراز
موقع ہو تو ہر بُت کو "خُدا" کہتے ہیں

افسوس تجھے پیر دغا دیتے ہیں
کب تیری عقیدت کا صِلا دیتے ہیں
مُنعِم! یہ تجھے نہیں لگاتے ہیں گلے
سینے سے تری جیب لگا لیتے ہیں

ہے ریش کو اِذن، لہر کھاتی جائے
شفّاف اُفق پہ دل کے چھاتی جائے
جتنی جتنی بڑھے درازی اِس کی
اُتنا ہی گناہوں کو بڑھاتی جائے

اُتنا ہی نہیں کہ جب دُعا دیتے ہیں
انساں ہی کو دھوکے میں پھنسا دیتے ہیں
یہ پیر تو ہر روز صفیں باندھ کے جوش
خود حضرتِ حق کو بھی دغا دیتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
اِنساں کو بہر طور دَغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنُہ جو احمق — اُن کو
بے رُوح نمازوں میں لگا دیتا ہے

آنکھوں میں لئے ہوئے "انا" بیٹھا ہے
مسند پہ بصد فخر تَنا بیٹھا ہے
"عصمت" کو جہاں ہے اعترافِ عصیاں
اُس بزم میں معصوم بنا بیٹھا ہے

قطرے میں تڑپ رہا ہے جیحوں گویا
جُنبش میں ہے فتر بہی کا افسوں گویا
زاہد! ترے بھیس میں بہ شکلِ انساں
غلطاں ہے زمیں پہ گنجِ قاروں گویا

جنّت کے مزوں پہ جان دینے والو
گندے پانی میں ناؤ کھینے والو
ہر خیر پہ چاہتے ہو ستّر حُوریں
اے اپنے خدا سے سُود لینے والو!

اے شیخ! نہ مجھ سے پوچھ حالت میری
دُنیا سے نرالی ہے طبیعت میری
تشویشِ ممات ہے تری صوم و صلوٰۃ
تعمیرِ حیات ہے عبادت میری

ہر جُرم ہے پُوچ، اُن کی خطا کے آگے
کِس مُنہ سے یہ جائیں گے خدا کے آگے
واللہ کہ معصوم ہیں رندانِ خراب
اِن زُہد فروش اولیا کے آگے

پیرانِ حرم صیدِ گنہگاری ہیں
سر تا بقدم غرقِ ریاکاری ہیں
زہّاد سے اور وجُودِ باری کا سوال!
یہ لوگ تو مُنکرانِ اقراری ہیں!

اے شیخ! بلندیٔ نظر ہے طاعت
تسخیرِ قُوائے بحر و بر ہے طاعت
محرابِ فتادگیٔ انساں کے خطیب!
اعلانِ بزرگیٔ بشر ہے طاعت

خمریات

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما   کہ اے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما

برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے   زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

(خیّام)

خیّام کے نام

ہشیار! کہ آفتاب ہونا ہے تجھے

پیغمبرِ انقلاب ہونا ہے تجھے

ہر صبح کو آتی ہے یہ ساقی کی صدا

بیدار! کہ خود شراب ہونا ہے تجھے

گردوں پہ ہے صبح کی جھلک اے ساقی

اُودی سی گھٹا ہے دُور تک اے ساقی

پڑتی ہے پھوار، ارغنوں لے، مے دے

پتّوں پہ ہے بُوندوں کی کھنک اے ساقی

ساقی! غمِ بیش و کم سے مرتا کیوں ہے؟
میں رندِ بلانوش ہوں، ڈرتا کیوں ہے؟
تو کون و مکاں کو رکھ دے شانے پہ مرے
اور میں کہوں رکھ، مذاق کرتا کیوں ہے؟

گلشن کی روش پہ مسکراتا ہوا چل
بدمست گھٹا ہے، لڑکھڑاتا ہوا چل
کل خاک میں مل جائیگا یہ زورِ شباب
جوشؔ آج تو بانکپن دکھاتا ہوا چل

مرنے پہ نویدِ جاں ملے، یا نہ ملے
یہ کُنج، یہ بوستاں ملے یا نہ ملے
پینے میں کسر نہ چھوڑ، او خانہ خراب
معلوم نہیں وہاں، ملے یا نہ ملے

ہر شمع کو شمعِ طور کر دے ساقی
آ ظلمتِ شب کو نُور کر دے ساقی
ہر چیز کی دُور سے ہے دنیا میں بہار
کونین کو مجھ سے دُور کر دے ساقی

"اوہام" و "یقیں" میں غرق کردے ساقی
آ، ذہنِ رسا کو برق کردے ساقی
اِس وسوسۂ ارض و سما کو للّٰہ
اُٹھ، رطلِ گراں میں غرق کردے ساقی

تقریر کے وقت کیوں نہ بولوں، ساقی؟
کیوں دل کی گرہ مے سے نہ کھولوں ساقی؟
"برباد" تو ہونا ہے بہرحال مجھے
دے جام کہ "آباد" تو ہو لوں ساقی؟

میداں میں ہیں جھٹپٹے کے بادل، ساقی

بجنے ہی پہ ہے رعد کی چھاگل، ساقی

بھر دے مرے پیمانۂ زریں میں شراب

قبل اس کے کہ ابر بھر دے جل تھل، ساقی

ہاں دیکھ تو یہ لاف و گزاف، اے ساقی

یہ بات ہے کس درجہ خلاف، اے ساقی

"اللہ" کے معصوم گنہ گاروں کو

"بندے" نہیں کرتے ہیں معاف، اے ساقی

طغیانِ زوال بھی، دکھا دے مجھکو
عصیاں کا مآل بھی دکھا دے مجھکو
سوگند جمال کی، نہ چھوڑوں گا شراب
آ، شانِ جلال بھی دکھا دے مجھکو

مفلوج ہر اصطلاحِ ایماں کردے
فردوس کو رہنِ طاقِ نسیاں کردے
ساقی ہے، مغنّی ہے، چمن ہے، مے ہے
اس نقد پہ سو اُدھار قرباں کردے

ساقی کا بہر رنگ نظارا کر لوں
مرتے مرتے بھی اِک اشارا کر لوں
آدم کا میں ناخلف ہوں فرزند اے جوشؔ
عصیاں سے اگر کبھی کنارا کر لوں

ساقی! قدحِ بادۂ گلگوں، للہ
حلقے میں لئے ہوئے ہے دل کو شبِ ماہ
میں، اور تصوّرِ بہشت و کوثر!
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

یہ وقت ہے وقتِ ہاؤ ہُو اے ساقی
برسات ہے غرقِ رنگ و بُو اے ساقی
دے جامِ زر، اُس وقت کی تجھ کو سوگند
جس وقت نہ میں ہونگا، نہ تُو اے ساقی

دریا کا شبِ مہ میں چھلکنا، ہے ہے
رخسارہ ساقی کا جھمکنا، ہے ہے
ساحل پہ دہکتے ہوئے پیمانے سے
پگھلے ہوئے سونے کا چھلکنا، ہے ہے!

کیا فائدہ شیخ! تجھ سے کینے میں مجھے
خشکی میں تجھے لطف، سفینے میں مجھے
عیّاش تو دونوں ہیں، مگر فرق یہ ہے
کھانے میں تجھے مزا ہے پینے میں مجھے

ہم دونوں ہیں اے فقیہ ہر دیوانے سے
مطلب ہے فقط دل کے بہل جانے سے
ہر شام و سحر کرتے ہیں عیّاشی ہم
تُو ظرفِ وضُو سے، اور میں پیمانے سے

ہاں، زہد یہاں رنگ جمائے تو سہی
اس جام پر، اس رات پہ چھائے تو سہی
"باطن" ہے یہاں ہر ایک ظاہر کا عیاں
اِس وقت فقیہہِ شہر آئے تو سہی

آتی ہے گھٹا مست بنائے گی ہمیں
افلاک پہ جھولے سے جھلائے گی ہمیں
ساقی! نہ رُکے ہات کہ دم بھر میں یہ رُت
ڈھونڈے گی بہت، مگر نہ پائے گی ہمیں

ہشیار! کہ پھر ابر نہ چھائے گا کبھی
یہ کُنج، یہ بوستاں نہ پائے گا کبھی
بھُولے سے جو بخشا ہے مشیّت نے تجھے
یہ لمحہ پلٹ کے پھر نہ آئے گا کبھی

یہ کِس کا تبسّم ہے فضا میں ساقی؟
یہ کِس کی جوانی ہے گھٹا میں ساقی؟
یہ کون بجا رہا ہے شیریں بَربط
بھیگی ہوئی بارش کی ہوا میں ساقی؟

یہ زمزمہ، یہ کیفِ عقیقِ سیّال

یہ وقت سے آزاد، ابدیّت کا جمال

مبہوت ہوا ہے رُوحِ فریبِ مہ و سال!

معدوم ہوا ہے ماضی و مستقبل و حال!

جاری اِس وقت ہے بصد گردشِ جام

معمُورہؔ ارواح سے پیغام و سلام

شق ہوا ہے گنبدِ طلسمِ ظلمات!

لو دے اُٹھے وجہِ ذوالجلال والاکرام!

مسند پہ مری رباب رکھ دے ساقی
بھر کر قدحِ شراب رکھ دے ساقی
گُل کر کے چراغِ علم و دانش، للہ
اس طاق میں آفتاب رکھ دے ساقی

مجروح نہ کر لُطف کے اوقات اے دل
تشویشِ مآل ہے خُرافات اے دل
روتا ہے کہ وقتِ صُبح رونا ہوگا
خاموش! کہ باقی ہے ابھی رات اے دل

انفاسِ حیات ہوں نہ گندے ہشیار
تا چند یہ بیش و کم کے دھندے ہشیار
میخانہ بھرا ہوا ہے' اور عمر ہے کم
ہُشیار رہو' اے خدا کے بندے! ہشیار

ساقی! مجھ کو رواں دواں جانا ہے
اِس بزم سے کل کشاں کشاں جانا ہے
بہتر ہے کہ پہلے ہی سے جاتے رہیں ہوش
جب یہ نہیں معلوم کہاں جانا ہے

ہر آن جگا رہی ہے قدموں کی صدا
کونین پہ چھا رہی ہے قدموں کی صدا
دے جام کہ بڑھتی ہی چلی آتی ہے موت
ہر سانس میں آ رہی ہے قدموں کی صدا

ساقی! کوئی اس سے بڑھ کے ہوگی نہ بدی
خود دیکھ کہ حالت ہے مری کتنی ردی
اک آن کو تُو نے ہات روکا مے سے
اور غم کی یہاں گزر گئی ایک صدی

دریا میں ہے چاند سے تلاطُم، ساقی
غلطاں ہے سُبو میں عکسِ انجم، ساقی
اِس وقت، وفا کے آنسوؤں کی سوگند
صرف ایک نگاہ، اک تبسّم، ساقی

بیزار ہیں کیوں تجھ سے زمانے والے
اے شاہد و مے سے لَو لگانے والے
اللہ بُتوں کو تُجھ پہ مفتُوں کر دے
مُنہ پھیر کے اے حرم سے جانے والے

تاخیر نہ کر ساقیٔ شیریں حرکات
ناقے کی طرف رواں ہے لیلائے حیات
اِک، ساقیٔ کوثر کے تصدّق، اک جام!
اب پاؤں رکاب میں ہے، اور باگ پہ ہات

ہے اَوج ہی اَوج پیش و پس، اے ساقی
باقی نہیں اب کوئی ہوس، اے ساقی
یہ طے ہوا آسمان ——— ساغر موقوف
وہ آگیا بابِ عرش ——— بس اے ساقی

کل رات کو اِک مغبچۂ بادہ فروش
ہنگامۂ رقص میں بصد جوش و خروش
یوں گرمِ سرود تھا کہ اے شاعرِ جوش
"یک قطرہ جنوں" گراں زِ صد قُلزمِ "ہوش"

پروا ہے کسے، دہر اگر ہے خوں ریز
اِک جَو کے برابر بھی نہیں خوف انگیز
تُو ساتھ اگر ہے تو جہنّم بھی ہے خُلد
اے بادۂ کہنہ و نگارِ نَو خیز

جو غم کو نہ دیکھے وہ نظر دے ساقی
انگور سے دل کے زخم بھر دے ساقی
قاتل ہے کوئی چیز تو احساس لطیف
اس تیغ کی باڑھ کُند کر دے ساقی

اچھی نہیں یہ دراز دستی، خاموش
انصاف سے دیکھ اپنی پستی، خاموش
یہ شور و شغب، بادہ پرستی کے خلاف
خاموش ہو عہد زر پرستی! خاموش

دے جام کہ ٹوٹے یہ سکوت، اے ساقی
دعوے ہیں فنا کے بے ثبوت، اے ساقی
"موجود" کبھی ہو نہیں سکتا "معدوم"
ہر ذرّہ ہے "حیّ ولا یموت"، اے ساقی

یہ ولولہ، یہ شباب، اللہ اللہ
یہ نہر، یہ ماہتاب، اللہ اللہ
کل تک تو فقط شراب کا بندہ تھا میں
اور آج ہوں خود شراب، اللہ اللہ!

دیکھ آم کے پودوں کا شباب، اے ساقی
سُن موسمِ باراں کا رباب، اے ساقی
دُنیا کیا شے ہے، اور عقبیٰ کیسی؟
یہ فصلِ شراب ہے، شراب اے ساقی

گو میرا وجُود ہے میانِ عدمَین
مجھ سے رہتی ہے رُوحِ عالم بے چین
کہتا ہوں جو "یا غفور" ہنگامِ صبُوح
ہلچل ہوتی ہے درمیانِ قطبَین!!

کُرسی سے بلند ہے نشیمن اپنا
فردوس پہ خندہ زن ہے گلشن اپنا
تو کوثر و تسنیم کا چھوڑے گا نہ ذکر؟
اچھا، تو نچوڑ دوں میں دامن اپنا؟

جی مے سے مرا بھر نہیں سکتا ساقی
ہستی سے کبھی ڈر نہیں سکتا ساقی
جب تک کہ ہے وجہِ ذوالجلال واکرام
واللہ کہ میں مر نہیں سکتا ساقی!

اِس شہر میں اک مَیں ہی قدح خوار نہیں
مجھ سا لیکن کوئی سیہ کار نہیں
کہتے ہیں کہ کرتا نہیں کیوں دعوئے زہد
یعنی یہ خطا ہے کہ ریاکار نہیں

افسوس ہے اے عقل سے خالی دُنیا
وابستۂ ننگِ بے کمالی دُنیا
کیا تو بھی ہے مستانہ خرامی کے خلاف؟
اے پیٹ کے بَل رینگنے والی دُنیا!

دے جام کہ دُشوار ہے سونا ساقی
انسان پر آ رہا ہے رونا ساقی
مقصودِ عمل کیا ہے؟ حُصولِ مقصد
مقصودِ حُصول کیا ہے؟ کھونا ساقی

دے بادہ کہ ہو عقل معطّل ساقی
اِک شے بھی نہیں یہاں مکمّل ساقی
تفصیل کی مُملکت میں دل تنگ ہوں میں
اجمال کی سلطنت میں لے چل ساقی

انجامِ طرب کا ذکر کرتے کیوں ہو؟
پیمانۂ دل کو غم سے بھرتے کیوں ہو؟
تا چند یہ تشویشِ مآلِ ہستی؟
اک روز مروگے، روز مرتے کیوں ہو؟

اب ہم سے بھی دُنیا میں کہاں ہیں ساقی
آنکھیں تری جانب نگراں ہیں ساقی
ہم کو نہیں آرزوئے تجدیدِ شباب
ہر جام میں سو جوانیاں ہیں ساقی

ہاں بارِ خرد سر سے اتارو ہم کو
مینہ زور سے پڑ رہا ہے یارو! بہکو
برسو، برسو، سیہ گھٹاؤ! برسو
بہکو، بہکو، شراب خوارو! بہکو!

کس شان سے پڑ رہا ہے پیہم پانی
گردوں پہ اڑا رہا ہے پرچم پانی
ہاں مطربہ! ہاں یونہیں چھماچھم للہ
گلشن میں برس رہا ہے جھم جھم پانی

رِندی میں نہیں ہے کم نگاہی ساقی
فرقِ منِ و شانِ کج کلاہی ساقی

اللہ کا بندے سے تعلق ہے جہاں
واں گم ہیں "اوامر" و "نواہی" ساقی

کیا کہیے سفینہ کھے سکوں گا کہ نہیں
ساقی! تجھے داد دے سکوں گا کہ نہیں

دے جام کہ اِتنا بھی نہیں ہے معلوم
اک اور بھی سانس لے سکوں گا کہ نہیں

ہر پھول کو سو جام پلانے والے
ہر ذرّے میں سو جشن منانے والے
کیوں آبِ نشاط و جامِ گِل ہے مقہور؟
اے عالمِ آب و گِل میں لانے والے!

پھر چھا گئے آسماں پہ بادل کالے
چل جھوم کے دریا کی طرف متوالے
قبل اس کے لگد زنی کرے پیکِ اجل
ساحل پہ ہواؤں کے تھپیڑے کھالے

یہ زمزمے، یہ نرت نہ رُکنے پائے
ساقی! یہ چلت پھرت نہ رُکنے پائے
حلقے سے بنا رہی ہیں بُوندیں سرِ آب
اے دائرے والے! گت نہ رُکنے پائے

ممکن ہے کہ اب جشنِ خرابات نہ ہو
اِس رات کے بعد پھر کوئی رات نہ ہو
ٹھہرو، کہ گلے تو مِل لیں، جانے والو!
ممکن ہے کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو

کیا شرحِ کتابِ زہد و عصیاں کر دوں؟

اضداد کی توحید نمایاں کر دوں؟

کہتا ہے فقیہہ شہر "موج باطل"

کیا "حق" کے مجسّمے کو عُریاں کر دوں؟

صہبا میں سفینۂ دل کا کھے لُوں ساقی

میخانے کو آب و رنگ دے لُوں ساقی

قبل اس کے کہ برہم ہو نظامِ انفاس

بے دَغدغہ اک سانس تو لے لُوں ساقی

پی آتشِ تر، سوزِ نہانی کی قسم!
جنگل میں برستے ہوئے پانی کی قسم
مہکائے نفس کو جوششِ بُوئے مَے سے
بُوئے لبِ گلرنگِ جوانی کی قسم

اے سہو کے حاملو! خطا کے بندو!
اے حرص کے حامیو! ہوا کے بندو!
تا چند بنے رہو گے یُوں مرکبِ عقل؟
راکب بھی کبھی بنو خدا کے بندو!

دل کی بھی ہے طرفہ رسم و راہ اے ساقی
تارا ہے کبھی، اور کبھی ماہ اے ساقی
دے بادہ کہ ہے اہلِ خرد کی منزل
مابینِ یقین و اشتباہ اے ساقی!

اوروں کو بتاؤں کیا ہیں گھاتیں اپنی
خود کو بھی سناتا نہیں باتیں اپنی
ہر ساعتِ خوش ہے مالِ مسروقۂ وقت
قدرت سے چھپا رہا ہوں راتیں اپنی

ہر آن جفا سے قلب ڈر جاتا ہے
ہر بات پر آسماں بپھر جاتا ہے
کرتا ہوں اُسے مالِ غنیمت میں شمار
جو لمحہ فراغت سے گزر جاتا ہے

آیا تھا جو سامنے وہ عفریت گیا
میں ہارنے والا تھا مگر جیت گیا
یعنی اِس عالمِ فساد و شر میں
صد شکر کہ دن آج کا بھی بیت گیا

پینے کو مئے ہوش رُبا لائی ہے
نشّے کے لئے سرد ہوا لائی ہے
گھبرا گھبرا کے پی، کہ تیری تقدیر
اس رات کو جنّت سے چُرا لائی ہے

ہاں مشغلۂ جام و سبُو جاری ہے
اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہُو جاری ہے
کھاتی ہے کچھ انسان سے ٹکّر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہُو جاری ہے

ہستی کی جب آگ دل نے تاپی ساقی
گردن زُہد و وَرَع کی ناپی ساقی
دے بادہ، ترا بھلا ہو، ڈرتا کیوں ہے؟
اِنسان تو ہے جنم کا پاپی ساقی

آدم کی سرشت کو، خدا را پہچان
مجبور پہ، اور جُرم و خطا کا بُہتان!
آ بزمِ طرب میں، کہ مری جیب میں ہیں
اِنساں کی نجات کے ہزاروں فرمان

رندوں کو روا ہے کامرانی ساقی
ہے روزِ جزا فقط کہانی ساقی
محشر میں اگر ہوتی بھی پُرسش بالفرض
دے لیگی جواب نوجوانی ساقی

پی جلد کہ کلیاں ہیں چٹکنے والی
راہوں میں ہے بُوئے گُل بھٹکنے والی
ہُشیار! کہ مژگانِ جہاں سے تری عمر
آنسو کی طرح ہے اب ٹپکنے والی

یہ زمزمۂ آب و ہوا کچھ بھی نہیں

یہ بارگہِ ارض و سما کچھ بھی نہیں،

ہاں جلد اُٹھا جام کہ یہ کہنہ سرا

اِک سانس کی مہلت کے سوا کچھ بھی نہیں

یاروں کے نہیں ہوش ٹھکانے ساقی

سجدوں میں ہیں شیخ سے پُرانے ساقی

انگور و طہور و حور و غلمان و قصور

کیا دُور کے ڈھول ہیں سُہانے ساقی

پستی سے گزر عرشِ معلّٰے ہو جا
پی اتنی کہ خود ہی روحِ صہبا ہو جا
ہاں بجھ کے چراغِ عقل! بن جا خورشید
ہاں ٹوٹ کے اے حباب! دریا ہو جا

وہ شہرِ طرب کو غم نے لوٹا، ساقی
وہ ہات سے جامِ عیش چھوٹا، ساقی
ہاں جلد اُٹھا جلد رباب و ساغر
ٹوٹا وہ حبابِ عمر ٹوٹا، ساقی!!

خوشوں سے ٹپک رہی ہے شبنم ساقی
فانوس ستاروں کے ہیں مدّھم ساقی
ہاں جلد اُٹھا جام کہ اب بزم نشاط
اِک آن میں ہے درہم و برہم ساقی

غالب ہے مرا جذبۂ غیرت مجھ پر
اِک قہر ہے ناکسوں کی صَولت مجھ پر
زاہد اگر آج مَے کو جائز کردے
اک قطرہ بھی پھر پیوں تو لعنت مجھ پر

ہُشیار! کہ دل سے تاب و تب جاتی ہے
آغوش سے لیلائے طرب جاتی ہے
ساقی! غمِ صبح و فکرِ فردا تا کے؟
دیتا ہے تو دے جام، کہ شب جاتی ہے

باغوں پہ وہ چھا گئی جوانی، ساقی
سنکی وہ ہوائے زندگانی، ساقی
ہاں جلد اُنڈیل، جلد بہتی ہوئی آگ
آیا وہ برستا ہوا پانی، ساقی!

آتی ہیں گھٹائیں نغمہ خوانی کے لئے
سو رنگ لئے ہوئے جوانی کے لئے
دے بادہ کہ سب سے بڑھ کے موزوں ہے ندیم!
یہ آگ برستے ہوئے پانی کے لئے

کیا جام دیئے ہیں متّصل اے ساقی
اب مست ہے بزمِ آب و گِل اے ساقی
میں جہل سے "ذرات" سمجھتا تھا اِنہیں
یہ تو ہیں دھڑکتے ہوئے دل اے ساقی

فردوسِ بریں مے کے فسانے پہ نثار
صد سازِ خرد، دل کے ترانے پہ نثار
جمعیّتِ خاطر پہ ہوس کی بنیادُ
کونین اُس ایک مُسکرانے پہ نثار

یہ زُہد و ورع، یہ اِتّقا، کچھ بھی نہیں
یہ فضل و ہُنر، یہ فلسفہ، کچھ بھی نہیں
دے بادہ کہ انتہائے علم اے ساقی
اقرارِ جہالت کے سوا، کچھ بھی نہیں

مخمور سے گیر و دار، توبہ توبہ

انصاف کا خلفشار، توبہ، توبہ

انساں کی سرشت، اور قانونِ سزا!

مجبور کا اختیار، توبہ توبہ

شعلے میں یہ طوفانِ رطوبت تاچند؟

خورشید کی انجمن میں ظلمت تا چند؟

اے کافرِ نعمت، اے "جوانِ صالح"!

تاچند، مشیّت سے بغاوت تاچند؟

کیا شیخ ملے گا گُل فشانی کر کے؟
کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے؟
تُو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے اُنہیں!
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!

معشوق کے رُخ سے چاندنی ہے شیریں
پیمانے میں ہے پرتوِ عقدِ پرویں
پیمانے میں گھول دے چہ دوزخ، چہ بہشت
معشوق پہ وار دے چہ دُنیا و چہ دیں

یہ ساعتِ مے ہے ناصحِ خوش اوقات
ایسے میں ذرا سمجھ کے کہنا کوئی بات
لوح و قلم و کُرسی و عرش و افلاک
اِس وقت کھڑے ہوئے ہیں باندھے ہوئے ہات!

جھُومی تاریک رات میرے دل میں
بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے سبُو ڈُبو کے اٹھایا جو رباب
گُم ہو گئی کائنات میرے دل میں

یہ لرزشِ صہبا، یہ ضیا بارئ ماہ
یہ زمزمہ، یہ عربدۂ چشمِ سیاہ
کل تک تو میں دُنیا میں تھا، اور اب دُنیا
خود میری ہتھیلی پہ ہے اللہ اللہ!

وہ رات گئے شراب ڈھلنا، ہے ہے
وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا، ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر
آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مَلنا، ہے ہے

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اِک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
"میں روحِ مئے ہوشربا ہوں، تسلیم!"

اُٹھ ایک نظر میں سیر کر دے ساقی
دل گر بہ صفت ہے شیر کر دے ساقی
کہتے ہیں جسے حیات و تشویشِ حیات
اُس دشمنِ جاں کو زیر کر دے ساقی

جو اہلِ ترنّم ہیں، لہکتے ہیں ضرور
فیضانِ صبا سے گُل مہکتے ہیں ضرور
جو "رِند" ہیں، پی کے گو بگڑتے تو نہیں
البتہ کبھی بہکتے ہیں ضرور

کس رات کو کی نہ بادہ خواری ہم نے
کب کاکلِ عشرت نہ سنواری ہم نے
اب تک تو یہ رات جس کو کہتے ہیں شباب
زلفوں ہی کے سائے میں گزاری ہم نے

کیا آج کی رات ہے بہکتی ہوئی رات
گاتی ہوئی چاندنی، لہکتی ہوئی رات
ہاں اور پلا کہ بہکنے پر ہے ندیم
بکھری ہوئی زلفوں سے مہکتی ہوئی رات

ہنگامۂ انوارِ الٰہی دیکھو
گُل رنگ ہے رات کی سیاہی دیکھو
پہلو میں صنم ہے، اور سبو میں صہبا
دیکھو، مستوں کی پادشاہی دیکھو

کل رات کو گیا جوش میں آیا ساقی
میرے نشیمن پہ گنگنایا ساقی
میں نے جو کہا مقصدِ ہستی کیا ہے
ساغر چھلکا کے مسکرایا ساقی

وحدت کو ہے ناگزیر کثرت ساقی
ہر جشن کو درکار ہے جلوت ساقی
زاہد کی نماز ہو کہ رندوں کی شراب
دونوں کا مزا ہے با جماعت، ساقی!

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر مبیں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

مستی لئے انکھڑیوں کے پیمانے میں
جس طرح کہ "رومان" ہو افسانے میں
یا جیسے یکایک ہو نزولِ الہام
یوں صبح کو آیا کوئی میخانے میں

پیمانے میں ہے بادۂ اسرار نواز
نغمے ہیں زمیں پہ آسماں پر آواز
پہلو میں مچل رہا ہے اک مست شباب
اے میری شب ماہ! تری عمر دراز!

اسرار، زباں کھول رہے ہیں، ٹھہرو
نشے کو مرے تول رہے ہیں، ٹھہرو
اے نغمہ گرانِ بارگاہِ ساقی
جبریلِ امیں بول رہے ہیں، ٹھہرو!

سجدے کا فلک کو حکم دیتا ہوں میں
جو نے حق میں سفینہ کھیتا ہوں میں
جس وقت سبوہات میں آجاتا ہے
نبضِ کونین دیکھ لیتا ہوں میں!

بیلوں پہ چھلک رہی ہیں بوندیں ساقی
خوشوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں ساقی
دے جام کہ برگہائے سبز و تر پر
رہ رہ کے کھنک رہی ہیں بوندیں ساقی

زیبا نہیں شیخ! زندگانی ایسی
اللہ سے اور بدگمانی ایسی
بے شاہد و بادہ جس کی راتیں گزریں
توہینِ مشیّت ہے جوانی ایسی

کل موتیوں کو رول دیا ساقی نے
سونے میں مجھے تول دیا ساقی نے
یہ سُن کے کہ کھُلتا نہیں مقصودِ حیات
میخانے کا در کھول دیا ساقی نے

مُتَفَرِّقات

جھکتا ہوں کبھی ریگِ رواں کی جانب
اڑتا ہوں کبھی کاہکشاں کی جانب

مجھ میں دو دل ہیں، اک تو مائل بہ زمیں
اور ایک کا رُخ ہے آسماں کی جانب

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے ترانہ اپنا
قُدرت سے ملا ہے مجکو صد حیف یہ حُکم
بہروں کو سُنائے جا فسانہ اپنا

خود اپنے ہی فرمان سے معزول ہوں میں
بُو جس کی ہے خُود حریف وہ پھُول ہوں میں
خود اپنی ہی تیغ سے ہوا ہے جو شہید
اے اہلِ جہاں! وہ طُرفہ مقتول ہوں میں

آلامِ کہن کی یاد آتی ہے مجھے
دیرینہ محن کی یاد آتی ہے مجھے
افسانہ جہنّم کے فرشتوں کا نہ چھیڑ
اربابِ وطن کی یاد آتی ہے مجھے

مفلس ہوں مگر وارثِ فطرت ہوں میں
اسرارِ پیمبری کی دولت ہوں میں
اے لمحۂ موجود ادب سے پیش آ
آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

مانا کہ سُبک خرام و خُود کام ہے وقت
بربادیٔ کونین کا پیغام ہے وقت
واللہ کہ میری ابدی محفل میں
پارے کی طرح لرزہ براندام ہے وقت

کچھ اور ہی رُت ہے بزمِ آب و گِل کی
اب فکر ہے ماضی کی نہ مستقبل کی
ہر سانس اُٹھا رہی ہے لاکھوں پردے
کس سمت یہ باگ مڑ رہی ہے دل کی؟

جب رخصتِ شباب پارا پارا ہوگا
دل کو رونے کا بھی نہ یارا ہوگا
حیران ہوں کہ داغِ شیب و ننگِ پیری
کیونکر مری غیرت کو گوارا ہوگا!

کیا عمر کے ساتھ جوش چلتا ٹھہرا
کیوں شیب کے سانچے میں نہ ڈھلتا چہرہ
"جذبات" پہ پہرہ، "وقت" پر عمر سوار
کیوں عمر سے آگے نہ نکلتا چہرہ؟

بھٹکے ہوئے انسان کو دیکھو تو ذرا
اس عقل کے نادان کو دیکھو تو ذرا
کس طرح اکڑ اکڑ کے رکھتا ہے قدم
دو پاؤں کے حیوان کو دیکھو تو ذرا

افسردہ نہ بن، لوگ بُرا مانتے ہیں
مُنہ اُترے، تو دوست اجنبی جانتے ہیں
چہروں کی شناخت اہلِ دُنیا کو نہیں،
چہروں کی فقط یہ آب پہچانتے ہیں

اب خواہشِ لذّات نہیں ہو سکتی
اب دن کے سوا رات نہیں ہو سکتی،
ذرِ کس لئے گھٹکھٹا رہی ہے دُنیا،
کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

تبلیغ کی دُھن میں ہے رسالت حیراں
تخلیق میں مصروف ہے شاعر کی زباں
تبلیغ ہے سنّتِ رسُولانِ سلف
تخلیق ہے سنّتِ خدائے دوجہاں

ہر دل پہ خُود اک بارِ گراں ہے اے دِل
اوروں کے لئے وقت کہاں ہے اے دِل
یہ غم میں ترے جو آہ بھرتے ہیں رفیق
یہ آہ تو برف کا دھواں ہے اے دِل

صف بستہ ہیں کُل صفات میرے آگے
بے پردہ ہے حُسنِ ذات میرے آگے
سجدے میں گِرے حیات میرے در پر
جُھک جائے کائنات میرے آگے

یہ ارض ہی کچھ ہے، نہ سما ہے واللہ
ہر خشک و تر ایک واہمہ ہے واللہ
راتوں کو کبھی پہونچتا ہوں وہاں
بندہ ہی جہاں ہے، نہ خدا ہے واللہ

یہ دبدبہ، یہ رواق، اللہ اللہ
کسریٰ کا یہ طرفہ طاق، اللہ اللہ
کیونکر نہ ترا فریب کھاتیں احمق
دنیا ترا طمطراق، اللہ اللہ

ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
تاریخ نے کی جلوہ نمائی کیا کیا
نکلا جو بصد شکوہ سلطاں کا جلوس!
شاعر کی گدائی مسکرائی کیا کیا

رازِ کون و مکاں کا محرم ہوں میں
بیتاب ہوں، بیچین ہوں، بیدم ہوں میں
مجھ میں پاتے ہیں پرورش ارض و سما
گہوارۂ طفلکِ دو عالم ہوں میں

قایم رہے یہ طور، یہ ممکن ہی نہیں
باقی رہے یہ دور، یہ ممکن ہی نہیں
احسان کیا ہے آج جس پر تو نے
کل وہ نہ کرے جور، یہ ممکن ہی نہیں

اِنسان ہے بے پناہ اژدر، بھاگو
بھاگو، اہلِ جنون و جوہر! بھاگو
یہ آ کے اگر پاؤں پہ رکھ دے سر بھی
لازم ہے کہ پاؤں سر پہ رکھ کر بھاگو

ساونت ہوں کب کسی سے ڈرتا ہوں میں
دوزخ سے نہ زندگی سے ڈرتا ہوں میں
اِس طنطنہ و بہادری کے باوصف
دُنیا! ترے آدمی سے ڈرتا ہوں میں

کب موت کی دل لگی سے ڈرتا ہوں میں
محشر سے، نہ زندگی سے ڈرتا ہوں میں
اغیار کی دشمنی سے ڈرنا کیسا!
احباب کی "دوستی" سے ڈرتا ہوں میں

موقع مجھے میرے حسبِ فطرت دیدیں
قابو میں مرے مری طبیعت دیدیں
کچھ روز ہنسی خوشی سے جی لوں میں بھی
احباب مجھے اگر اجازت دیدیں

احباب کی یہ مزاجدانی، افسوس
یہ کفر بدوش بدگمانی، افسوس
جوشؔ اور بنے عدوئے اربابِ ادب!
افسوس ہے اے سرشتِ فانیؔ! افسوس

آئینۂ قلب کاش دھولوں دم بھر
کب کا جاگا ہوا ہوں، سولوں دم بھر
دے اتنی تو جمعیتِ خاطر یارب
بگڑی ہوئی تقدیر پہ رولوں دم بھر

یہ معجزہ قسمت نہ دکھائے گی کبھی
اے دل! یہ امید بر نہ آئے گی کبھی
یعنی دُنیا بگڑے کے نادانوں سے
داناؤں کو بھی گلے لگائے گی کبھی

اے عطر کے دریا میں نہانے والو
ماہِ رمضاں کے ناز اٹھانے والو
اسلام ہے صدیوں سے محرّم بردوش
بیدار ہو اے عید منانے والو

کیا درد کی داد چاہتا ہے کوئی؟
تقدیر کو یاس راہتا ہے کوئی؟
ہر گام پر آتی ہے خفیف اک آواز
کیا زیرِ قدم کراہتا ہے کوئی؟

کچھ لطفِ شبستاں نہ اُٹھایا تھا ابھی
ہونٹوں پہ تبسم ہی سا آیا تھا ابھی
ناگاہ سحر نے آہ بھر کر پُوچھا
کس بات پہ جوش! مسکرایا تھا ابھی

تخئیل کی وسعتیں عیاذاً باللہ

کس طرح زباں ہو نہ حیران و تباہ؟

الفاظ لرز کے ڈال دیتے ہیں سپر

جس وقت گزرتی ہے معانی کی سپاہ؟

سمجھاؤں کن الفاظ میں تجھ کو ہمراز

اللہ رے سحر کے وقت کا سوز و گداز

اس طرح چٹکتی ہیں چمن میں کلیاں

اطفال کی ہچکیوں کی جیسے آواز

ہمراز ہے کون گلستاں کا اے دِل
انداز نرالا ہے یہاں کا اے دِل
کہتا ہے جسے "داغ" یہ قلبِ گُل میں
دراصل "تصوّر" ہے خزاں کا اے دِل

جب رات کو جھُومتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں تپکتے ہیں دِلوں کے چھالے
قُرباں ترے، اُس وقت کی تاریکی میں
انگشت سحر سے دل کو چھُونے والے!

غلطاں ہیں جبینِ شب میں ظلمت کے نکات
ہستی کا فسانہ کہہ رہے ہیں ذرّات
جھرمٹ میں ستاروں کے ہے سرگرمِ سخن
ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بھیگی ہوئی رات

آئی ہے صبا چمن میں گانے کے لئے
گانے کو نہیں، خُون رُلانے کے لئے
فریاد! کہ ناعاقبت اندیش کلی
پر تول رہی ہے مُسکرانے کے لئے

کیوں بہرِ صلوٰۃ مجکو دُکھ دیتا ہے؟
کشتی مری کوئی اور ہی کھینتا ہے
جھکتا ہوں پئے سجدہ تو میرے سر کو
وہ بڑھ کے کلیجے سے لگا لیتا ہے

مجھ کو غمِ روزگار نے دی یہ صدا
ہٹ جاؤں، اگر بار نہ اُٹھتا ہو مرا
حیرت سے کہا میں نے اٹھا کر نظریں
تُو دل میں ہے موجود؟ مجھے علم نہ تھا!

ڈر ہے کہ نہ تلخ زندگانی ہو جائے
تمہیدِ الم نہ شادمانی ہو جائے
ہاں یارِ عزیز سے خدارا ہشیار
ممکن ہے کہ کل عدوئے جانی ہو جائے

ارمان ہیں جس دل میں، وہ آباد نہیں
شادی کی جسے ہوس ہے وہ شاد نہیں
ہر بندِ گراں کو توڑنے کے باوصف
اپنا جو غلام ہے وہ آزاد نہیں

جو عشق کے غم کو زندگی کہتے ہیں
رونے کو نشاط و سرخوشی کہتے ہیں
لیکن غمِ دنیا پہ ہو جس کی بنیاد
اُس آہ کو ہم مسخرگی کہتے ہیں

ہر منظرِ زشت دخوب بھاتا ہے مجھے
ہر ذرّہ نئی جھلک دکھاتا ہے مجھے
پھولوں میں بھی امتیاز کرتا تھا کبھی
کانٹوں پہ بھی اب تو پیار آتا ہے مجھے

بیگانۂ ابتدا نہیں ہوں شاید

ناواقفِ انتہا نہیں ہوں شاید

ہو طولِ حیات کی تمنّا مجھکو!

اِتنا تو میں بے حیا نہیں ہوں شاید

مرضی ہو تو سُولی پہ چڑھانا یارب!

سو بار جہنّم میں جلانا یارب

معشوق کہیں "آپ ہمارے ہیں بزرگ"

ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

رقصاں ہے ہر اک روش پہ سیلمابِ حیات
روشن کتنے ہیں گلستاں کے آیات
سرو و سمن و سنبل و نسرین و گلاب
اللہ رے عروسِ رنگ و بو کے کلمات!

حق کی ہے "عدالت" میں نرالی رفتار
ہوتا ہے ہر اک قدم پہ باطل سے دوچار
سچ "قطعِ منازل" پہ نہیں ہے قادر
جب تک کہ نہ ہو جھوٹ کے کاندھے پہ سوار

یہ بزمِ ہوس نہ ہوگی کب تک برہم؟
ہر ذرۂ خاک کی ہے اک افسانۂ غم
ہشیار! کہ کھا چکی ہے یہ خاکِ لئیم
صد افسرِ کیقباد و صد طرۂ جم

مرتے ہیں کہ قائم ہو مجالس میں بھرم
ثابت ہو کہ عالم ہیں بڑے پائے کے ہم
معنی سے نہیں ہیں اہلِ مکتب آگاہ
الفاظ سے یہ طیور بھرتے ہیں شکم

ہر سانس میں سو بلائیں سہنے والے
امواجِ نفس کی رَو پہ بہنے والے
اللہ تری شمع کو روشن رکھے
اے رہگزرِ باد پہ رہنے والے!

انصاف! جہنّم سے ڈرانے والے
اے وقتِ مدد کام نہ آنے والے
کیوں حُسن کے حملے سے بچایا نہ مجھے
یُوسف کو زلیخا سے بچانے والے

دُنیا محدود، کارِ دُنیا محدود
دریا محدود، موجِ دریا محدود
ہر چیز ہے محدود، مگر دل کے طفیل
ہر آن مسرّت ہے مری لامحدود

اسرار کا عقل میں نہ آنا دیکھو
ہر گام پہ سو فریب کھانا دیکھو
مشغولِ مباحثہ ہیں پیرانِ کہن
بوڑھے بچّوں کا چہچہانا دیکھو

جاری ہے گلوں کے درمیاں گفت و شنود
موضوعِ مکالمت ہے "انجامِ نمود"
کھِلتی ہوئی کلیوں پہ ہے شبنم دمِ صبح
اِک موجِ تبسم ہے، مگر اشک آلود

مجبور ہوں، مُنہ موڑ نہیں سکتا ہوں
رشتے ہیں قوی، توڑ نہیں سکتا ہوں
احباب ہیں منجملہ "عاداتِ قبیح"
واقف ہوں، مگر چھوڑ نہیں سکتا ہوں

ہر راہ میں اک شور ہے راحت کے لئے
ہر گام پر اک حشر ہے عشرت کے لئے
مخلوق کی جست و خیز توبہ، توبہ
ساری یہ اُچھل کُود ہے دولت کے لئے

شیون ہی میں گو شباب کاٹا ہم نے
پر عہد یہ کامیاب کاٹا ہم نے
آنکھوں نے تمام رات تارے بوئے
اور صبح کو آفتاب کاٹا ہم نے

قبروں سے اُبل رہے ہیں غم کے سوتے
مرنے والے نہ کاش پیدا ہوتے
کچھ بن نہ پڑا تو سو گئے آخر کار
آرام کی آرزو میں روتے روتے

صد شکر کہ آ گئے شہابی جاڑے
کلیوں میں بسے ہوئے حبابی جاڑے
بھینی بھینی رضائیوں کے قابل
ہلکے پھلکے، خنک، گلابی جاڑے

ہر شاخ میں کیا برگ و ثمر آتے ہیں
بچھڑے ہوئے مُدّت کے، نظر آتے ہیں
یہ خاکِ گلستاں کے ہیں وہ جاں پرور خواب
جو برگ و ثمر بن کے اُبھر آتے ہیں

شاعر کا ہے دربارِ زر و گوہر لے
آئی ہے تو موتیوں سے دامن بھر لے
تیری بھی خواہش ہے نوائے روحِ جہاں
آ، اور مجھے دُور سے سجدہ کرلے

پستی جو قریب آئے، اُبھر جا، اے جوشؔ
دل ہے تو بگڑنے میں سنور جا، اے جوشؔ
کونین تری راہ میں حائل ہے اگر
کونین کو ٹھکرا کے گزر جا، اے جوشؔ

اپنے ہی سے کسبِ نُور کرتا ہوں میں
کب خواہشِ برقِ طُور کرتا ہوں میں
بندے! مرے نازِ شاعری سے نہ بگڑ
اللہ سے بھی غرور کرتا ہوں میں

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری
بیچارے کی اک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیّل میں بڑھاپا بیتا
جنّت کی دعاؤں میں جوانی گزری

زاہد نے بھی کیا حیاتِ فانی کاٹی!
آغوشِ لحد میں زندگانی کاٹی
مُلّاؤں کی خدمت میں لڑکپن کھویا
پیروں کی ولایت میں جوانی کاٹی

موسم سے جُدا ہے زندگانی تیری
خُنکی میں بھی خشک ہے کہانی تیری
جاڑے کی مسّیں بھیگ رہی ہیں اے جوشؔ
کس خوابِ گراں میں ہے جوانی تیری؟

بگڑی ہوئی عقل سے حماقت بہتر
دھوکے کی محبّت سے عداوت بہتر
شیطان و ابوجہل کی عظمت کی قسم
سو بار غلامی سے بغاوت بہتر

تیری تجلی کو خس سمجھتا ہوں میں
کونین کو اک نفس سمجھتا ہوں میں
کیا مجھکو ڈرا رہا ہے "مرنا" "مرنا"
مرنے کو پرِ مگس سمجھتا ہوں میں!

قدموں پہ مرے عرشِ معلّٰی بھی سہی
خورشید کی انجمن میں ذرّہ بھی سہی
حوریں حاضر ہوئی ہیں مجبور کے لئے
اچھا حاضر کرو، یہ تقویٰ بھی سہی

کتبہ: محمد شریف عباسی خوش نویس لاہور
جنوری ۱۹۴۴ء